ڈاکٹر وزیر آغا اور تحسینِ غالب

ڈاکٹر سعدیہ طاہر*

Abstract:

The main focus of this essay is the evaluation of Dr. Wazir Agha's critical appreciation of Mirza Asad Ullah Ghalib's Urdu poetry. Dr. Wazir Agha has presented his arguments in the context of latest advances of Natural as well as Social sciences. The main thrust of Dr. Agha's argument is that notwithstanding the fact that Ghalib lived in the 19th century, he belongs to 20th century on the basis of his modern sensibility.

غالب اور اقبال اپنے اپنے دور کی دو ایسی یگانہ روزگار ہستیاں ہیں جن کے فکر و فن سے ڈاکٹر وزیر آغا کا گہرا اور پائیدار علمی شغف ہمیشہ قائم رہا ہے۔ علوم تازہ کے تناظر میں ہر دو کے فکر و فن سے ڈاکٹر وزیر آغا نے جدید فنی نظریات بھی اخذ کیے ہیں اور ان نظریات کی روشنی میں ان دونوں کے فکر و ہنر کا تنقیدی اور تجزیاتی جائزہ بھی لیا ہے۔ ہر چند ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کے فکر و فن پر ''تصوات عشق و خرد.....اقبال کی نظر میں'' کی سی کوئی مبسوط کتاب نہیں لکھی تاہم انہوں نے وقتاً فوقتاً غالب کے فکر و فن پر متعدد مقالات تحریر کیے ہیں۔ سجاد نقوی نے ان متفرق مقالات کو ''غالب کا ذوقِ تماشا'' کے عنوان سے ایک کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔ غالب پر ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک اور اہم مقالہ بعنوان ''غالب کا ایک شعر'' اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ البتہ یہ مقالہ ان کے مجموعہ مقالات بعنوان

* شعبہ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

''معنی اور تناظر'' میں شامل ہے۔

غالب کے نزدیک قاری اور تماشائی ایک ہی سلسلے کے دو رُخ ہیں۔ غالب کو وزیر آغا نے پہلی بار آوٹ سائیڈر اور شہاب ثاقب قرار دیا جو ضرورت پڑنے پر بروئے کار آتا ہے اور کبھی کبھار نمودار ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں ''غالب کی خوبی یہ ہے کہ وہ تماشا میں خود کو یکسر ختم کرنے کے باوجود ایک ''تیسری آنکھ'' سے اپنے اس عمل کا مظاہرہ بھی کرتا ہے اور یوں انبوہ سے اوپر اُٹھ آتا ہے۔ غالب یہ رجحان زندگی کی نفی سے روح تک پہنچنے کا عمل نہیں بلکہ زندگی کی سچائی کو قبول کر کے روحانی رفعت کی تحصیل کا عمل ہے جو صوفی کے بجائے فن کار کو حاصل ہوتا ہے۔(۱) وہ اپنے اس مضمون کا خلاصہ مضمون کی اختتامی سطروں میں پیش کرتے ہیں:

> ''وہ حیات و کائنات کا تماشا کرنے کے لیے فاصلے یا انقطاع کا نہیں بلکہ قرب اور ہم آہنگی کا قائل ہے اور ہر شے میں اس کے خاص وصف کی نسبت سے دلچسپی لیتا ہے مثلاً وہ نیرنگ تمنا کا تماشا محض نیرنگ تمنا کی خاطر کرتا ہے اور ارزانی مئے جلوہ کو سامنے پا کر مست ہو جاتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ زمین آسمان کا آئینہ بن گئی ہے تو کھل اٹھتا ہے۔ پھر یکا یک سبزہ و گل اور پری چہرہ لوگوں کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے اور دوسرے ہی لمحے رخش عمر پر خود کو محسوس کر کے اپنی بے بسی کا تماشا دیکھنے میں بھی تامل نہیں کرتا۔ جو شخص زندگی کو اصل سمجھنے سے گریزاں ہو وہ زندگی کے مظاہر کے بارے میں ایسے شدید اور متنوع جذبات کا اظہار کیسے کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب تماشا کو محض بچوں کا کھیل نہیں سمجھتا، گوشت پوست کی زندگی کا ایک مظہر قرار دیتا ہے لیکن اس کا قلب روشن اور نگاہ تیز بھی ہے اس لیے اسے ہمہ وقت اپنے تماشا بننے کی حثیت کا عرفان بھی حاصل رہتا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں!(۲)!''

اپنے مضمون بعنوان ''غالب ایک جدید شاعر'' میں ڈاکٹر وزیر آغا پہلے جدیدیت کے مفہوم پر روشنی ڈالتے ہیں اور پھر جدیدیت کے تناظر میں غالب کا مقام متعین کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں جدیدیت کی پہچان یہ ہے کہ:

اول: ''جدیدیت ہمیشہ تخریب اور تعمیر کے سنگم پر جنم لیتی ہے۔ جدیدیت صرف اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب فکری تناؤ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں مسلمہ اقدار اور آداب ریزہ ریزہ ہونے لگتے ہیں اور اقدار و آداب کی ایک نئی کھیپ وجود میں آنے کے لیے بے قرار ہو جاتی ہے۔.....آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے جب معاشرہ میں ابھی شکست و ریخت کی بالکل ابتداء تھی اور زندگی ابھی جُڑی ہوئی تھی تو غالب وہ واحد شخص تھا جس نے بیسویں صدی کے ویسٹ لینڈ کے ابھرتے ہوئے سایوں کو دیکھا اور ان کے

بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ کو سنا اور پھر اپنے تجربات کو شعر میں پوری طرح منتقل کر دیا۔

دوم : یہ ایک ایسے فرد کی آواز ہے جو احساسی اور ذہنی طور پر فعال ہو کر تخلیقی سطح پر بیدار ہو گیا ہو۔..... جدیدیت ادب میں ایک مثبت تحریک ہے جو ایک فعال اور تخلیقی اعتبار سے زرخیز فرد کی آواز ہے۔ جذباتی مدوجزر سے گزرنے کے بعد وہ ایک ''طرحِ نو'' کا مبلغ اور ایک نئے عہد کا علمبردار ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک جاگیردارانہ نظام اور ایک منجمد سوسائٹی میں رہنے کے باوجود غالب کی حساس طبیعت نے ماحول کی گھٹن سے اسی طرح برگشتگی کا اظہار کیا جیسے کہ آج کا برہم نوجوان کر رہا ہے اور اس نے ایک نئے عہد کو تخلیق کرنے کی بالکل اسی طرح خواہش کی جیسے کہ آج کا ایک خلاق فرد کرتا ہے اور پھر دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ غالب آج کے حساس فرد کی طرح اپنی ذہنی اور جذباتی صلاحیتوں سے واقف تھا اور اپنی طباعی اور جدت طراز طبیعت کا عرفان رکھتا تھا نیز قدم قدم پر اپنے ماحول کے انجماد اور افراد کی بھیڑ چال میں اثبات ذات کا اظہار کرنے پر خود کو مجبور پاتا تھا۔

سوم : غالب نے اپنی انفرادیت کا بھرپور اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کو نشانۂ تمسخر بھی بنایا اور اپنے جذباتی تقاضوں پر مسکرانے کی روش بھی اختیار کی اور یوں ذات کے حصار سے باہر آ کر خود اپنی انفرادیت میں ایک نئی سطح کا اضافہ کر کے اسے مکمل کر دیا۔

چہارم : جدیدیت کا ایک امتیازی وصف روح عصر سے شناسائی بھی ہے اور جو شعراء اس سے بہرہ مند ہوتے ہیں ان کے کلام میں ایک ایسی کھلی کھلی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے لامحدود علم رکھنے والے اور ایک محدود ماحول میں زندگی بسر کرنے والے شعراء عام طور سے محروم ہوتے ہیں۔ جدیدیت کے اس خاص وصف کا ذکر یوں ہوا کہ غالب، روح عصر سے شناسائی کے اعتبار سے بھی، اپنے دور کے باقی شعراء سے بالکل الگ اور ممتاز کھائی دیتا ہے درآنحالیکہ اس کے اپنے زمانے میں یہ شعور ابھی پوری طرح پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔..... جب غالب کے اشعار کو پڑھا جائے تو قاری کو فوراً احساس ہوتا ہے کہ وہ انیسویں صدی کے وسط میں رہنے والے کسی شخص کا کلام نہیں پڑھ رہا بلکہ بیسویں صدی کے ایک حساس اور باشعور فرد کے خیالات سے مستفید ہو رہا ہے۔ غالب کو یہ شعور کہاں سے ملا اور کن محرکات نے اس شعور کو صیقل کیا، شاید ابھی ایک طویل مدت تک اس کا کوئی سراغ نہ مل سکے لیکن اس کے وجود سے ایک معمولی نظر رکھنے والا قاری بھی انکار نہیں کر سکتا۔

پنجم : غالب مذہبی عقائد کی تشہیر کی بجائے مذہبی تجربے سے گزرنے کے عمل کے باعث بھی جدید ذہن کا حامل

ثابت ہوسکتا ہے (۳)۔''

جدیدیت کی اس تعبیر کے تناظر میں غالب کو انیسویں صدی میں سانس لیتے ہوئے بیسویں صدی کا شاعر قرار دینا ایک ایسا نادر و نایاب خراج تحسین ہے جو ڈاکٹر وزیر آغا کے علاوہ آج تک کسی اور ادبی نقاد نے پیش نہیں کیا۔ اس بحث کے دوران ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کی شاعری میں سیاسی اور معاشرتی احساس کی جیتی جاگتی عکاسی سے بھی غالب کی منفرد شخصیت اور شاعری کی تحسین کی ہے۔ انیسویں صدی میں بیٹھ کر بیسویں صدی کے جدید طرز احساس کے علمبردار غالب کو خود بھی اس حقیقت کا عرفان تھا کہ وہ آج کے نہیں بلکہ آنے والے کل کے شاعر ہیں:

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

اس کتاب میں ایک اور مضمون ''غالب کی آوارہ خرامی'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں غالب کی آزادہ روی اور آوارہ خرامی کا تجزیہ اور تعارف پیش کیا گیا ہے۔ وزیر آغا نے غالب کو ایک سیاح قرار دیا ہے جس کا پاؤں عمر بھر سفر میں رہا اور جو مختلف شہروں کی حویلیوں سے ہوتا ہوا دیار ابد کی طرف چل دیا۔ انہوں نے تا زیست اپنا مکان نہیں بنوایا اور کرائے کے مکانوں میں عمر کاٹ دی مگر انہوں نے اپنی ذات کا گہرا سفر کیا تھا۔ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک بے قرار روح کے مالک تھے۔ ایک ایسی روح جو اپنے وجود کے زنداں میں پھڑ پھڑاتی رہی۔ اس ضمن میں وہ غالب کی تشبیہات کے مطالعے کے دوران ان کی آوارہ خرامی اور آزادی روی کو یوں بے نقاب کرتے ہیں:

> ''تشبیہہ بجائے خود آوارہ خرامی کے رجحان پر دال ہے کہ یہ کسی شے یا کیفیت کو بعینہ پیش کرنے کے بجائے ہمیشہ اتنے تقابل سے پیش کرتی ہے اور یوں گویا ایک شے سے پھدک کر کسی دور کی شے پر بسیرا کرنے کے بعد واپس اپنی اصلی جگہ پر آ جاتی ہے۔ تشبیہہ کسی شے کی نرمی یا گرمی کا احساس دلانے کے لیے ناظر کا ہاتھ پکڑ کر اسے شے سے مس نہیں کرتی بلکہ اسے پہلے کوئی اور شے دکھاتی ہے پھر اصل تفہیم اس درمیانی شے کے وسیلے سے کرتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تشبیہہ بجائے خود ایک خاصا متحرک انداز بیان ہے اور ان طبائع کو زیادہ عزیز ہے جو آوارہ خرامی کو پسند کرتی ہیں (۴)۔''

تشبیہات اور استعارات کے ساتھ ساتھ تخیل کو بھی وزیر آغا نے غالب کی آوارہ خرامی کا مظہر قرار دیا ہے۔ غالب سیر و سیاحت کے دلدادہ تھے۔ سفر کے لئے ہمہ دم متحرک رہتے تھے۔ ایسا سفر جس کی کوئی منزل نہ ہو اور سفر کی ایسی پیاس جو بجھنے کا نام نہ لے۔ اس ضمن میں وزیر آغا کا کہنا یہ ہے کہ: ''قیاس یہ ہے کہ دراصل منزل ان

کے باہر نہیں بلکہ اندر تھی اور اندر کی یہ منزل ایک ایسی تجدید تھی جسے وہ خود بھی گرفت میں لینے سے قاصر تھے۔ اسے ایک ایسی آگ یا پیاس کا نام دینا چاہیے جو اپنی تکمیل کی خواہاں تھی اور ہر اس شے کو خود میں سمو لینا چاہتی تھی جو اس خلا کو پُر کر سکے (۵)۔''

''غالب اور فیض'' کے عنوان سے اپنے تقابلی مطالعے کے دوران ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب اور فیض کی شخصیت اور شاعری میں گہری مماثلت کی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے غالب اور فیض کو ہمہ دم مسافر ثابت کیا ہے۔ دونوں نے زندگی بھر سیر و سفر کیا ہے۔ دونوں عمر بھر آوارہ خرامی اور آزادہ روی کے مسلک پر قائم رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ: ''غالب کے تتبع میں تو نہیں البتہ غالب کی سی بے قرار طبیعت کا مالک ہونے کے باعث فیض بھی ایک مستقل نوعیت کی آوارہ خرامی کی زد میں رہے۔ ان کی داستان حیات کے اس پہلو کا بطور خاص ذکر کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ یہ ایک بالکل سامنے کی بات ہے کہ کیسے ان کا ایک قدم لندن میں، دوسرا ماسکو میں، تیسرا بیروت اور چوتھا ہندوستان میں ہوتا تھا۔ درمیان میں وہ اپنے ملک میں بھی ایک معطر جھونکے کی طرح گھوم جاتے تھے۔ آخر میں تو زیادہ عرصہ دیارِ غیر میں رہنے لگے (۶)۔''

ڈاکٹر وزیر آغا غالب اور فیض کے سیاسی شعور کی کارفرمائی کو بھی ایک قدر مشترک قرار دیتے ہیں اور ان کے شعری اسلوب میں بھی گہری مماثلت پاتے ہیں۔ وہ دونوں کی شخصیت اور شاعری میں مماثلت کی تلاش کو قید و بند پر ختم کرتے ہیں:

> ''خاتمہ کلام سے پہلے میں ایک دلچسپ مماثلت کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ غالب اور فیض دونوں قید و بند کے تجربے سے گزرے اور دونوں کو قمار بازی کے الزام میں سزا ملی۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالب پر تو عام سی جوابازی کا الزام تھا جب کہ فیض سیاسی نوعیت کی قمار بازی کے مرتکب ہوئے۔ جوابازی کی نوعیت کے فرق کے باعث ان دونوں کے ہاں نتائج کا فرق بھی مرتب ہوا، وہ یوں کہ غالب کو تو بدنامی اور بے عزتی کے احساس نے کچل ڈالا اور اس کے لیے زمانے کا سامنا کرنے کی سکت نہ رہی مگر فیض کو قید و بند کے واقعہ نے پرواز عطا کر دیئے اور وہ ہر دلعزیزی کی ایک گرم و گداز فضا میں شہرت کے ساتوں افلاک کو پار کر گئے (۷)۔''

بلاشبہ ہر دو شاعروں کی زندگی اور شاعری میں قید و بند کی مماثلت دلچسپ ہے مگر ڈاکٹر وزیر آغا کا فیض کی زندگی میں قید و بند کی واردات کو قمار بازی کے الزام میں غالب کے قید و بند سے مماثلت قرار دینا قرین انصاف نہیں۔ فیض کے ادبی و سیاسی نظریہ و عمل کو ''سیاسی نوعیت کی قمار بازی'' قرار دینا محلِ نظر ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک غالب کے کلام میں تصوف کے چند پہلو نمایاں ہیں۔ بلاشبہ کلام غالب میں

صوفیانہ عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وزیر آغا نے ان عناصر کو نمایاں کرنے میں الگ زاویہ نگاہ سے کام لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ : ''غالب نے اس انداز نظر سے انحراف کیا۔ اس نے ماضی کے شکنجے سے خود کو آزاد کر کے حال کے اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں سے وہ مستقبل کی طرف جست بھر سکتا تھا مگر اس جست کے لیے اسے قوت درکار تھی۔ صدیوں کے صوفیانہ تصورات نے ''خواہش'' کے قتل سے وہ قوت کشید کی تھی جس نے انہیں اعلیٰ روحانی مدارج پر فائز کر دیا تھا۔ جب کہ غالب نے خواہشات کے ''سنجوگ'' سے ایک متوازی قوت اخذ کی..... غالب ہزاروں خواہشوں کو جن میں سے ہر ایک پر اس کا دم نکلتا تھا ایک نکتے پر مرتکز کر کے ''کامنا'' بنا دیا۔ پھر اس نے نہ صرف اس سے پھوٹنے والی حدت سے قوت حاصل کی بلکہ آخر میں اس ''کامنا'' کو بجائے خود ایک اور قوت کے روپ میں بھی دیکھا۔ ایک ایسی قوت جسے اس نے ''تمنا'' کہہ کر پکارا ہے(۸)۔'' ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کی شاعری اور نثر کے آئینے میں غالب کی شخصیت کا عکس دیکھنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے اور غالب کے بارے میں سلیم احمد کے اُٹھائے ہوئے ایک منفی سوال کا مثبت اور موثر جواب بھی پیش کیا گیا ہے مگر مجھے ایک اور مضمون بعنوان ''غالب کا ایک شعر''، تخلیقی عمل کے باب میں ڈاکٹر وزیر آغا کے مسلسل اور غیر مختتم علمی جستجو کا حاصل نظر آتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک اور قابل قدر مطالعہ غالب کی شاعری اور عبدالرحمٰن چغتائی کی مصوری میں فکر و خیال کی مماثلت کی نشاندہی پر مشتمل ہے۔

''غالب کا ایک شعر'' ڈاکٹر وزیر آغا کے مجموعۂ مقالات بعنوان ''معنی اور تناظر'' میں شامل ہے۔ تخلیقی عمل کے مختلف پراسرار مراحل کو ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کے درج ذیل شعر کے آئینے میں دیکھنے اور پہچاننے کی کامیاب کوشش کی ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

سائنسی علوم میں جدید اور جدید تر پیش رفت کے تناظر میں ڈاکٹر وزیر آغا نے تحریر کی کائناتی معنویت پر روشنی ڈالتے وقت اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ:

> ''حیاتیات اور طبیعات نے لکھنے کے عمل کو جو اہمیت دی ہے اور دریدا اور اس کے ہم نواؤں نے گفتار کے مقابلے میں ''تحریر'' کو جس طرح فاضل گردانا ہے یہ سب بیسویں صدی کی سائنسی اور فکری پیش رفت کا ثمر ہے مگر آج سے بہت پہلے قرآنِ حکیم نے لکھنے کے عمل کو جس طرح افضل اور برتر جانا، اس کی مثال کسی اور فکری نظام میں نظر نہیں آتی۔ اسلام سے قبل نئی انجیل نے متکلم لفظ کے حق میں آواز بلند کرتے ہوئے کہا تھا: ''ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا

تھا'' مگر اس کے کم وبیش سات سو برس بعد قرآنِ حکیم نے پڑھنے کے عمل کو بذریعہ قلم آگے بڑھانے کی تلقین کی۔ لفظ سے قلم تک کا یہ فاصلہ ایک انقلابی نوعیت کا تھا جس کا یہ مطلب تھا کہ تحریر کا اپنا ایک فعال وجود ہے یا شاید یہ کہ کائنات بجائے خود ایک طرح کی تحریر یا sign system ہے ویسے بھی قرآن حکیم میں نشانیوں یا sign کا ذکر بار بار آیا ہے جو ایک لمحہ فکر یہ مہیا کرتا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس قرآنی نظریئے کی صدائے بازگشت یورپ کی نشاۃ الثانیہ میں بھی سنائی دی ہے۔''(۹)

جس تخلیقی عمل کے جو اسرار غالب کے اس شعر میں جلوہ گر ہیں ڈاکٹر وزیر آغا ان کی نشاندہی درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

''غالب کے زیرِ نظر شعر کے عام مفہوم کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالبِ تخلیقِ کار کے قلم کی آواز کو نوائے سروش گردانتا ہے اور تخلیق کار کو محض ایک ذریعہ سمجھتا ہے جسے ''مضمون'' اپنے اظہار کے لیے بروئے کار لاتا ہے لیکن اس شعر کی اطراف کو کھولنے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ غالب نے تخلیق کاری کے عمل کو محض خوشہ چینی کا عمل قرار نہیں دیا۔ اس نے اس کے چار مراحل کا ذکر کیا ہے۔ پہلا ''غائب'' کا مرحلہ جو تحریر اور تقریر، دونوں سے ماورا ہے۔ دوسرا تحریر کا مرحلہ جب عبارت کوندوں، لکیروں، قوسوں، Traces اور Tracks کی صورت غیب کے ناموجود پر بطور ایک خاکہ نمودار ہوتی ہے۔ اس کے بعد ''خیال'' کا مرحلہ جب اس خاکے پر تصویریں بنتی ہیں۔ چوتھا مرحلہ ترسیل کا ہے جب آواز تحریر کو دوسروں تک پہنچاتی ہے جیسے آر این اے، ڈی این اے کی ترسیل کرتا ہے۔ لہٰذا غائب کے مرحلے کے بعد اولیت ''مضمون'' کی تحریر اور خیال کی تجسیم کو حاصل ہے نہ کہ آواز کو جو ہر چند کہ ان کے ساتھ ہی پیدا ہوگئی تھی مگر جو قدرے تاخیر سے اپنی منزل پر پہنچی۔ غالب کے اس شعر میں تحریر کو مقدم اور افضل قرار دینے کی جو جہت نمودار ہوئی ہے اس سے شعر کے عام مفہوم میں نئے ابعاد پیدا ہو گئے ہیں۔ اب یہ شعر کسی ایک معنی تک محدود نہیں رہا بلکہ تخلیق کاری کے process کو بیان کرنے لگا ہے۔ دوسرے لفظوں میں sign کے بجائے signification کو اور ایک خاص معنی کے بجائے معنویت کے جہان کے دروازے کھول رہا ہے۔''(۱۰)

یوں ڈاکٹر وزیر آغا غالب کی شاعری میں تخلیقی عمل کے اسرار کی تلاش میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تخلیقی عمل میں قلم بجائے خود وہ نورانی عبارت ہے جو بہ یک وقت تحریر بھی ہے، تصویر بھی اور صریر بھی۔ انہی اسرار کی تلاش انہیں عمر بھر آفاقی ادب پاروں میں بار بار غوطہ زن ہونے اور اس غواصی سے نت نئے آبدار موتی ڈھونڈھ لانے کی سعادت اور مسرت سے شاد کام کرتی رہی۔

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''غالب کا ذوقِ تماشا''، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۷ء، طبع اول، ص ۴۲

۲۔ ایضاً، ص ۳۰۔۳۱

۳۔ ایضاً، ص ۵۶، ۵۷، ۶۵، ۶۶، ۷۱

۴۔ ایضاً، ص ۴۲

۵۔ ایضاً، ص ۴۶

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۷۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۸۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''معنی اور تناظر''، ص ۲۸۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۸۶

❁❁❁